ڈاکٹر ممتاز خان کلیانی

شعبہ اردو بہاء الدین یونیورسٹی ، ملتان

جاوید اختر سلیانہ

شعبہ اردو بہاء الدین یونیورسٹی ، ملتان

عاصمہ رفعت

شعبہ اردو بہاء الدین یونیورسٹی ، ملتان

جھنگ میں اُردو آپ بیتی کی روایت

Dr.Mumtaz Khan Kalyani, Urdu Department, B Z University, Multan

Javaid Akhter Salyana, Urdu Department, B Z University, Multan

Asma Rifat, Urdu Department, B Z University, Multan

Tradition of Urdu Autobiography in Jhang

Autobiography is quite ancient, very popular and common genera of Literature. There is a wealth of autobiographies in almost all leading languages of the world. Muqaddma Ibn-e-Khaldoon, Kitab-ul-Hind by Alberoni. Tuzk-e-Babari and Tuz-e-Jahangeri are some of the legend autobiographies.

The present studies deals with the tradition of Urdu autobiography in Jhang. The First paragraph of the study contains the nature and definition of autobiography while in the next portion the authors have traced a brief but comprehensive history of autobiographies in Urdu language published till the end of the twentieth century.

The rest and the substantial portion of the study aim at providing critical appreciation of a few leading autobiographies written by authors belonging to Jhang, like Dr. Mohsin Maghayana and Mahar Jeaven Khan.

کسی بھی شخص کا اپنی زندگی کے قابل ذکر واقعات اور اپنی فطرت وسیرت کو خوبیوں خامیوں سمیت تحریری صورت میں پیش کرنا آپ بیتی کہلاتا ہے۔ فارسی میں اسے خودنوشت اور انگریزی میں Autobiography کہتے ہیں کامیاب زندگی ایک فن ہے اسی لیے

کامیاب آپ بیتی ایسا فنِ لطیف ہے جو اپنی ذات سے متعلق حقائق کے اظہار کا نام ہے مگر اسے متعلق ذات ہونے کے ساتھ ساتھ جگ بیتی بھی ہونا چاہیے ایک ہاتھ اگر اپنے دل کی دھڑکن پر ہو تو دوسرا زمانے کی نبض پر، یہ آمیزش جتنی عمدہ ہوگی۔ آپ بیتی اتنی ہی قابلِ ستائش ہوگی اور زیادہ عرصہ تک زندہ رہے گی بقول محمد طفیل (مدیر نقوش):

> ''آپ بیتی کسی انسان کے تجربات، مشاہدات، محسوسات، نظریات اور عقائد کی ایک مربوط داستان ہوتی ہے۔ جو خود اس نے بے کم و کاست اور راست راست قلم بند کر دی ہو۔ جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہوں، اس کے نہاں خانوں کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کے سوا اس کی داخلی کیفیات کے حجرے میں بھی جھانک سکیں۔''

مولانا جعفر تھانیسری کی 'تواریخ عجیب' المعروف 'کالا پانی' کو اُردو میں پہلی آپ بیتی تسلیم کیا جاتا ہے جو انھوں نے عبور دریائے شور کے بعد لکھی یہ ۱۸۸۰ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی، اسی سال 'نواب صدیق حسن بھوپالی' کی 'البقا المن بلقا المحن' بھی شائع ہوئی۔ بنگال کے مشہور شاعر اور نقاد عبدالغفور نساخ کے ۱۸۸۶ء تک کے حالات زندگی پر مشتمل آپ بیتی مخطوطے کی شکل میں کلکتہ کی ایشاٹک سوسائٹی آف بنگال کی لائبریری میں محفوظ رہی، اسے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا گیا۔ نواب اکبر علی (رئیس پاٹودی) کی بیٹی شہر بانو نے 'بیتی کہانی' کے عنوان سے اپنی بپتا لکھی۔ یہ کتابی صورت میں دیباچے کے اضافے کے ساتھ ۱۸۸۷ء میں منظر عام پر آئی۔ مولانا حسرت موہانی کو جب ۱۹۰۹ء میں جیل سے رہائی ملی اور اردوئے معلیٰ کا سلسلہ دوبارہ جاری ہوا تو 'مشاہداتِ زندان' کے عنوان سے ان کی آپ بیتی اس میں شائع ہوتی رہی بعد میں شارق پبلی کیشنز کراچی نے اسے 'قیدِ فرنگ' کے نام سے شائع کیا۔

ظہیر دہلوی کی خودنوشت 'داستانِ غدر' ۱۹۱۵ء میں اور خواجہ حسن نظامی کی 'آپ بیتی' ۱۹۱۹ء میں منظر عام پر آئی، منشی محمد عنایت حسین کی 'سرگزشتِ ایامِ غدر' ۱۹۳۶ء میں چھپی۔ چودھری افضل حق کی سرگزشت 'میرا افسانہ' ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ اسی سال حکیم احمد شجاع کی آپ بیتی 'خوں بہا' لاہور سے شائع ہوئی۔ سر رضا علی کی خودنوشت سوانح عمری 'اعمالنامہ' ۱۹۴۳ء اور مشہور مزاح نگار 'شوکت تھانوی' کی 'مابدولت' ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی، جس میں مابدولت اپنے کارنامے اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت کے عیب بھی برے نہیں لگتے:

> ''پڑھائی سے زیادہ برے لڑکوں کی صحبت کے اثرات ہم نے قبول کرنا شروع کر دیئے، نہایت سڑی سڑی گالیاں سبق سے زیادہ یاد کر لیں، بغل بجانے کے کرتب سیکھے، سڑک پر کھڑے ہو کر مداریوں کے تماشے دیکھنے لگے، مختصر یہ کہ اس مدرسہ میں تربیت حاصل کی کہ اس کے بعد ہم اس قابل رہ گئے تھے کہ یکہ ہانکتے یا کباب پراٹھے کی دکان سجا کر بیٹھ رہتے۔''

چراغ حسن حسرت، کی فرمائش پر عبدالمجید سالک نے 'سرگزشت' کے نام سے آپ بیتی لکھی۔ شاد عظیم آبادی نے 'کمالِ عمر' کے نام سے آپ بیتی لکھی، جو ۱۹۵۸ء میں 'شاد کی کہانی، شاد کی زبانی' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی آپ بیتی 'میری دنیا' ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی جو اسلوب اور زبان و بیان کے حوالے سے بھی ایک اچھی کاوش ہے۔ ذوالفقار علی بخاری' کی 'سرگزشت' ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی آپ بیتی 'یادوں کی دنیا' ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی، مصنف نے اپنے خاندانی پس منظر، اور خاندان کے

افراد، اور اپنے حالات بڑی تفصیل کے ساتھ دیئے ہیں مگر اس میں اہل وعیال کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

'یادوں کی برات' جوش کی زندگی کے تمام پہلو سمیٹے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی، مواد اور اسلوب کے لحاظ سے لکھنویت کی ترجمان آپ بیتی نے مثبت اور منفی ہر طرح کی تنقید کے در کھول دیئے جس کی وجہ سے وہ مشہور بھی ہوئی اور متنازعہ بھی۔ ۱۹۷۲ء میں 'شورش کاشمیری کی 'بوئے گل، نالہ دل، چراغِ محفل' شائع ہوئی۔ اسی سال رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی 'آشفتہ بیانی میری' شائع ہوئی، جس میں علی گڑھ کی داستان زیادہ ہے اور اپنی کہانی کم، اگرچہ اسلوب بہت اچھا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں احسان دانش' کی آپ بیتی 'جہانِ دانش' شائع ہوئی، جبکہ آپ بیتی کا دوسرا حصہ 'جہان دیگر' دانش کی وفات کے بعد چھپا۔

خواجہ غلام السیدین کی آپ بیتی 'مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں' ۱۹۷۴ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ ۱۹۷۴ء میں صدیق سالک نے 'ہمہ یاراں دوزخ' کے نام سے خودنوشت لکھی جس میں سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے اپنے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کو پیش کیا ہے، کلیم الدین احمد کی منفرد کہانی 'اپنی تلاش میں' ۱۹۷۵ء میں منظر عام پر آئی۔ ۱۹۷۶ء میں شائع ہونے والی 'زرگزشت' میں مشتاق احمد یوسفی نے مقدمے سے ہی شگفتگی بکھیرنے کا آغاز کیا ہے جو اختتام تک ساتھ ساتھ چلتی ہے، 'قرۃ العین حیدر' کی دو جلدوں پر مشتمل آپ بیتی (☆☆) 'کارِ جہاں دراز ہے' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی جسے سوانحی ناول بھی کہا جاتا ہے۔

۱۹۷۹ء میں عبدالماجد دریابادی کی 'آپ بیتی' شائع ہوئی۔ مرزا ادیب' کی آپ بیتی 'مٹی کا دیا' جولائی ۱۹۸۱ء میں لاہور سے چھپی۔ 'گردِ راہ' اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی ہے جو پہلے 'افکار' کراچی میں قسط وار اور بعد میں مکتبہ افکار کراچی سے ۱۹۸۴ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی خودنوشت 'شام کی منڈیر سے' ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ شہرت بخاری کی آپ بیتی 'کھوئے ہوؤں کی جستجو' ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔ اسی سال قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت 'شہاب نامہ' منظر عام پر آئی 'شہاب نامہ' کی شہرت ومقبولیت کا ایک اہم سبب اس کا مابعد الطبیعاتی اور افسانوی اسلوب بھی ہے۔ نصرت جہاں سلیم کی آپ بیتی، 'میرے ساتھی' میرے غازی' میرے شہید' ۱۹۹۰ء میں اسلام آباد سے شائع ہوئی اختر حسین رائے پوری کی اہلیہ حمیدہ اختر کی آپ بیتی 'ہمسفر' ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آئی۔ کشور ناہید کی آپ بیتی 'بری عورت کی کتھا' ۱۹۹۴ء میں ہندستان سے شائع ہوئی۔ بعد ازاں ۱۹۹۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ ادا جعفری کی آپ بیتی 'جو رہی سو بے خبری رہی' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔

زیرِ نظر تحقیقی مضمون کا مقصد پاک وہند میں اُردو آپ بیتی کی تاریخ اور نوعیت کے تناظر میں جھنگ میں اُردو آپ بیتی کی روایت کا مطالعہ کرنا ہے۔ جھنگ میں اُردو آپ بیتی کا آغاز ڈاکٹر محسن مگھیانہ کی خودنوشت ''انوکھا لاڈلا'' سے ہوا۔ جو ۱۹۹۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ جس کے بارے میں انیس ناگی لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر محسن مگھیانہ جیسے لوگوں کا ادب میں آنا نہایت خوش آئند بات ہے ان کی خود نوشت سوانح 'انوکھا لاڈلا' ہماری معاشرتی زندگی کے تجربات کا بحرِ ذخار ہے، ڈاکٹر محسن نے زندگی کو بہت قریب سے بلکہ اس کی گہرائیوں میں اتر کے دیکھا ہے، ان کا انداز بیان بہت سادہ، بے ساختہ اور دلچسپ ہے۔''[۳]

سادہ اور بے ساختہ اندازِ بیان جس کی طرف انیس ناگی نے اشارہ کیا ہے، اس کتاب کا وصفِ خاص ہے مثلاً آغاز ہی میں قاری

کو اس کی جھلک نظر آتی ہے:

''ہم زنانہ وارڈ میں تو پیدا نہیں ہوئے بلکہ گھر میں ہوئے تو لوگ عش عش کر اٹھے اس لیے نہیں کہ ہم حسنِ یوسف لے کر پیدا ہوئے بلکہ اس لیے کہ ہم بڑے حساب سے اور قرینے سے یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو وارد ہوئے ویسے اس میں ہمارا تو کوئی کمال نہیں تھا بس قدرت یہی چاہتی تھی کہ ہم اس دن پیدا ہوں جب سارے لوگ خوشیاں منا رہے ہوں، پپی نیو ائیر کی تقریبات تو اس سے پہلے بھی ہوتی ہوں گی، مگر بعد میں ہم نے خود ہی یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ شاید لوگ ہماری سالگرہ منا رہے ہیں۔''

[انوکھا لاڈلا، ص ۴۷]

اس کے ساتھ ہی مصنف کا مخصوص مزاحیہ انداز جسے انھوں نے 'مخولیا انداز' کا نام دیا ہے اس کو مزید دلچسپ بنا دیتا ہے:

''یوں اس تاریخ کے حساب سے ہمیں ایک بکری الاٹ ہوئی۔ اب آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ چونکہ ہم زمیندار خاندان میں سے ہیں اس لیے کوئی جانور ہی الاٹ ہونا تھا بلکہ ہمارا مقصد برج ہے کیونکہ جدی capricorn برج کا نشان بکری ہے۔ سنا ہے کہ ہماری پیدائش پہ نارنگیاں تقسیم ہوئیں شاید والدین اس نارنگی خیال سے متاثر ہوئے۔''

[انوکھا لاڈلا، ص ۴۷]

مصنف معاشرتی ناہمواریوں اور زندگی کے تلخ حقائق کو اپنے ذاتی تجربات میں شامل کرتا ہے تو مخولیا انداز کی نثر لکھنے والا رُلا بھی دیتا ہے:

''اگلے دن ماسٹر نے ہمیں کلاس میں کھڑا کر لیا۔ ماسٹر صاحب اس وقت کلاس لیتے ہوئے گنا چوس کر اپنا گلوکوز لیول بڑھا رہے تھے انھوں نے دودھ نہ لانے پر اسی گنے سے ہماری زوردار پٹائی کی۔ شاید یہ سمجھے کہ پتنگ اڑاتے رہے ہیں اور یوں دودھ لانا بھول گئے تھے ہم نے وضاحت دینا چاہی، لیکن چونکہ انھوں نے ہمیں خود پتنگ اڑاتے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے ہمیں روئی کی طرح دھنک دیا۔''

[انوکھا لاڈلا، ص ۵۰]

ایک اور استاد کی شفقت کی مثال دیکھیے:

''ایک بار انھوں نے کسی کے شور کرنے پر ساری کلاس کو اتنا مارا کہ صرف ہمارے ذاتی کھاتے میں تیس ڈنڈے آئے کل حساب کر لیں تو ہزاروں ڈنڈے بنتے ہیں''۔

[انوکھا لاڈلا، ص ۵۵]

اگر تدریس جیسے مقدس اور پیشہ پیغمبر کے وارث ایسا سلوک روا رکھیں جو نہ صرف ایک فرد بلکہ آنے والی نسلوں کو جہالت، اخلاقی پستی اور غربت کی طرف دھکیل دے تو ایسی صورتِ حال پر مصنف بہت افسردہ ہوتا ہے۔ رقم طراز ہیں:

'یہ صرف ان کا وطیرہ ہی نہیں ایسے سکولوں میں ہزاروں بچے صرف اسی مار کی وجہ سے پڑھائی چھوڑ جاتے ہیں جو ماسٹر جتنا ظالم ہوتا ہے ہو، وہ سکول میں اتنا ہی اکڑ کر پھرتا ہے، جیسے فرعون ہو اور ایسے لوگوں نے سزا دینے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کیے ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے بچہ سکول میں نہیں تھانے میں آ گیا ہو، بلکہ شاید تھانے والوں نے بھی سزا کے طریقے سکولوں کے ایسے ماسٹروں سے سیکھے ہوں۔''

[انوکھا لاڈلا،ص ۵۱]

محسن مگھیانہ نے پاکستانی قوم کے اجتماعی طرزِ فکر وعمل کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اس میں مثبت اور منفی دونوں طرح کے رویے اور طرز احساس شامل ہیں، مثلاً یہاں کے پرانے لوگوں کے ذہن پر انگریز یا انگریزی کا نام سن کر عجیب تصور اُبھرتا ہے کہ، اگر بتایا جائے کہ انگریزی فلم دیکھی ہے تو اس کا مطلب بقول مصنف ''ٹوٹے'' دیکھ کر آیا ہے اس کے ساتھ ہی اپنے دیسی لوگوں کے دلوں میں مقاماتِ مقدسہ اور قرآن کی تعظیم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اتنا احترام وہ مسلمان نہیں کرتے جو اس ملک میں رہتے ہیں جہاں قرآن نازل ہوا:

''دوسری طرف ہمارا عربی سے محبت کا یہ عالم ہے، ہماری عزیزہ حج پر گئیں تو دیکھا کہ سعودی عرب میں ایک آدمی فٹ پاتھ پر قرآن مجید رکھے بیچ رہا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا اور فوراً قرآن مجید اٹھا کر اس شخص کی جھولی میں ڈال دیئے۔ وہ شخص ہنسا اور کہا 'انــــتَ مـــن البـــاکستان'۔'' [انوکھا لاڈلا،ص ۱۱۷]

جہاں مصنف نے خو کے اعتبار سے پاکستانیوں کی سادہ لوحی کا ذکر کیا ہے وہاں کچھ اجتماعی منفی عادات کی نشاندہی بھی اس کتاب میں ملتی ہے:

''ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ تحقیق کرنا تو انگریزوں کا کام ہے اس لیے ایسے فضول کاموں کے لیے ہمارے پاس فرصت کہاں۔ پھر جب پکی پکائی کھیر مل جاتی ہو تو بھلا ہم اسے مارکیٹ سے کیوں نہ خرید لیں، اب بھلا کون آئن سٹائن کی طرح تکلّف کرتا پھرے۔ پھر ہمیں اور بھی تو بہت ضروری کام ہیں مثلاً چوبیس گھنٹوں میں جب تک پانچ چھے گھنٹے کھل کر گپ نہ لگائی جائے، دوسروں کی چغلی نہ کر لی جائے تب تک دل کہاں بھرتا ہے ویسے ایک گھنٹہ کام کر کے اتنی تو بوریت ہو ہی جاتی ہے کہ پانچ چھے گھنٹے آرام کیا جائے۔''

[انوکھا لاڈلا،ص ۱۰۵]

مصنف کو بچپن ہی سے انوکھے شوق تھے جن کو وہ نویکلے شوق کہتے ہیں جبھی تو بڑے ہو کر انوکھا لاڈلا لکھی ایسے ہی ایک شوق کا عالم دیکھئے:

''قلمی دوستی کا شوق چرایا' حافظ عبدالعزیز کی نقل کرتے ہوئے شہنشاہ ایران کو خط لکھ ڈالا تو انھوں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ہمارے اور ہمارے دوستوں کے لیے آٹھ تصاویر آدھی شہنشاہی لباس میں اور آدھی تھری پیس سوٹ میں بھیج دیں تب ہم نے ماؤزے تنگ اور چو ین لائی کی تصاویر بھی منگوالیں اس عمر میں یہی بڑی بات لگتی تھی ہم خط میں ڈائریکٹ شہنشاہ ایران

سے مخاطب ہوئے وہ بھی ہماری سادگی پر مسکراتا ہوگا۔ یہی شوق اب بھی کبھی کبھی موجزن ہوتا ہے اسی لیے تو ہم کبھی شہزادہ چارلس کبھی لیڈی ڈیانا اور کبھی سارہ فرگوسن کو خط لکھ دیتے ہیں ویسے ہم لوگ تو انگریزوں کی اس ادا پر ہی قربان ہو جاتے ہیں کہ وہ خط کا جواب ضرور دیتے ہیں چاہے نہ میں ہی کیوں نہ ہو۔''

[انوکھا لاڈلا، ص۵۶]

پنجابی زبان کا استعمال مصنف کی دیگر تصانیف کی طرح اس خودنوشت میں بھی موجود ہے قارئین کی سہولت کے لیے اُردو ترجمہ بھی لکھ دیتے ہیں مصنف کی تحریر کے مقامی رنگ، مقامی عناصر کے ساتھ مل کر مے دوآتشہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں:

''آٹھویں میں ہم ماسٹر اللہ بخش صاحب کی کلاس میں تھے، وہ بھی ہیڈ ماسٹر محمد علی کی طرح لمبے قد کے وجیہہ آدمی تھے اور باوقار تھے۔ اسی دوران ہمیں ماسٹر دوست محمد صاحب سے بھی مختلف مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ تو ہر وقت قوم کے غم میں گھلتے رہتے تھے اور کہتے رہتے: ''ایس قوم دا کے بنسیں (اس قوم کا کیا بنے گا)۔''

[انوکھا لاڈلا، ص۵۶]

اس خودنوشت کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ مصنف کا اپنے تعلیمی کریئر کے دوران جتنے دوستوں، ہم جماعتوں، جونیئر، سنیئر ساتھیوں اساتذہ، ڈاکٹروں اور دیگر احباب کے علاوہ بیسیوں شاگردوں سے تعلق رہا ان کے صرف نام یا سرسری ذکر ضرور کیا ہے۔ اس سے جو صورتحال پیدا ہوگئی ہے اس کا مصنف کو بھی احساس ہے:

''ہوسکتا ہے کہ بعض قارئین ناموں کی بہتات کو محسوس کریں مگر یہ ہماری مجبوری تھی جن کے نام شامل ہیں وہ تو ہمیں انشاء اللہ ضرور دعا دیں گے ..... ہمارے اس طرح ڈھیر سارے نام لکھنے کا ایک یہ فائدہ ہے کہ یہ کتاب شادی شدہ جوڑوں کے لیے 'مشعلِ راہ' بلکہ 'مشعلِ نام' ثابت ہوگی، وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کی پیدائش پر ان کے نام اس میں آسانی سے ڈھونڈ سکیں گے۔''

[انوکھا لاڈلا، ص۳۱]

لیکن اس عذر لنگ سے بات کچھ بنی نہیں مثلاً 'پسِ نوشت اور پس پسِ نوشت' کے مصنف 'پروفیسر پرویز پروازی' نے صرف اس ایک کمزور پہلو کی بناء پر اس کی خوبیوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے بہ یک جنبشِ قلم کشتنی قرار دے دیا ہے:

''یہ خودنوشت ایک نوجوان ڈاکٹر کی خودنوشت ہے۔ جو عام نوجوانوں کی طرح ادب میں جلد از جلد اپنا مقام بنا لینے کا خواہش مند ہے۔ اس خودنوشت کی حیثیت کا تا اور لے دوڑی کی ہے ..... ان کی خودنوشت تیز رو میں لکھی ہوئی ڈائری ہے، جس میں انھوں نے اپنے ساتھ کے طلبا و طالبات کے اسمائے گرامی کی ایک فہرست بھی مرتب کر دی ہے۔''

محسن مگھیانہ کالج میں یونین لیڈر رہ چکے تھے، غالباً اس لیے کسی کو ناراض نہ کرنے کی عادت میں ایسا کیا ہوگا اور پھر محسن بھائی' تو سب میں اس قدر مقبول تھے کہ پروفیسر بھی انہیں محسن بھائی کہا کرتے۔ کالج کے سٹیج ڈرامے کا منظر ملاحظہ ہو جس میں رنجیت سنگھ کے دربار میں ایک لڑکی کی درخواست زیرِ غور تھی اور اسے کوئی بھی رشتہ پسند نہیں آ رہا تھا آخر وزیر شادی کہتا ہے اب میں جس کا نام لینے والا ہوں وہ تمھیں ضرور پسند آئے گا، لڑکی اور وزیر شادی کا مکالمہ کافی دلچسپ ہے۔ لڑکی کہتی ہے:

''جی فرمایئے''

'مہاراج اس کا رشتہ محسن مگھیانہ سے کر دیا جائے'

ہال میں ایک دم سناٹا چھا گیا ہم نے بھی سانس روک لی۔ ہمیں بھی کچھ امید بندھی کہ چلو اسی بہانے ہمارا بھی کام 'تمام' ہو جائے گا

'محسن مگھیانہ' نرس نے بڑے اشتیاق سے کہا!

'ہمارے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں تمام لوگ متوجہ ہو گئے'

'نہیں یہ ناممکن ہے'

ہم رنجیدہ ہو گئے کہ یہ ایک رشتہ بھی ہاتھ سے نکل گیا

'کیوں'

رنجیت سنگھ بارعب آواز میں حیرت سے بولے۔

'مہاراج وہ ہیں تو بہت اچھے'

'پھر.....پھر تمہیں کیا اعتراض ہے'

'مگر وہ تو محسن بھائی ہیں'

'مارے گئے'

.....ہم نے اچانک کہا ایک تو اس بھائی کے لیبل نے یونیورسل بنا دیا ہے۔

سو ہال میں ایک ہم ہی تھے جو خاموش تھے باقی سب کھل کر قہقہے لگا رہے تھے۔''

[انوکھا لاڈلا، ص۹۶]

اس خودنوشت میں ڈاکٹر محسن مگھیانہ طبی اصطلاحات کو نہایت آسان زبان بلکہ 'دیسی الفاظ' میں بیان کرتے جاتے ہیں، اسلوب میں سادگی، روانی، لطافت اور شگفتگی نمایاں ہے انسانی نفسیات کی ترجمانی بھی خوب کی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی سب سے اہم خوبی مطالعے میں آسانی (Readablity) ہے جو کہیں بھی قاری کو بوجھل محسوس نہیں ہوتی، تعصّبات سے بالاتر ہو کر تجزیہ کیا جائے تو کم از کم 'کاتا اور لے دوڑی' والی کیفیت سے مختلف ہی کوئی صورت برآمد ہوگی۔

'پسرِ دہقان' پروفیسر مہر محمد خان نول کی مختصر آپ بیتی ہے جو انھوں نے گورنمنٹ کالج جھنگ سے وائس پرنسپل کے عہدے سے سبکدوشی کے بعد تحریر کی۔ وہ خود اسے آپ بیتی نہیں کہتے بلکہ 'اپنی زندگی کی یادداشتیں کہتے ہیں یہ یادداشتیں غیر روایتی انداز میں سپردِ قلم کی گئی ہیں

اپنے جد کے قبول اسلام کا واقعہ اساطیری رنگ میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرا مورثِ اعلیٰ ۹واں پردادا اپنے کئی رشتہ داروں کے ساتھ مل کر چُنڈ پتن کے قریب گائیں چرا رہا تھا ان لوگوں نے حضرت شاہ جیونہ کو دودھ کی چاٹی پیش کی، جو مع مرید پتن پر کشتی کے انتظار میں تشریف فرما تھے۔ حضرت نے اپنی چادر چاٹی پر ڈال دی۔ سارے پور☆۱ کو دودھ پلا دیا اس سے متاثر ہو کر بزرگ نے معہ بیٹے کے اسلام قبول کر لیا اور شاہ صاحب نے ان کے نام شریف اور لطیف رکھ دیئے وہاں کی برادری مخالف ہو گئی جس پر موصوف نے اپنے جانور علیحدہ کر لیے اور مختصر کنبہ دریا کے کنارے مویشی چراتا چراتا روانہ ہوا۔''

[پسر دہقان، ص۶]

پروفیسر سمیع اللہ قریشی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ تحریر بہت سارے اعتبارات سے سادہ مگر بے حد پر کار ہے، تصنع سے یکسر عاری لفظی اور اسلوبی ملمع کاری سے یکسر بے نیاز اور سیدھی دل کی تہوں سے نکل کر نوک زباں پر آئی ہوئی تحریر ہے۔ شاید اسی باعث دلچسپی کا رس ساتھ ساتھ رہتا ہے، جس سے اس کا لفظ لفظ مملو ہے۔ اگر جھنگوچی پنجابی لہجے میں لکھی ہوتی تو اس کا ثقہ پن اور مزا دوگنا ہوتے۔ ہر چند کہ یہ کتاب ایک شخصی مطالعہ ہے.....فقط ذاتی احوال ہی قرار نہیں پاتے بلکہ پورے مقامی وسیب کے طرزِ بود و ماند، زندگی کے ہر سطح پر بکھرے ہوئے انسانی رویے اور نفرتوں کی ایک گونہ داستانی تحریر بھی ہے، جو اپنی بولتی ہوئی شہادت آپ ہے۔ دوابوب نے خاص طور پر متاثر کیا۔ ایک ان کی مرحومہ بیوی کی سنگت کی خوب صورت یادیں، دوسرا تذکرہ ارضِ حرم میں ان کا اسلوب تحریر مختلف ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی اور محمد خان ہے۔ یہاں ان کی تحریر کے الفاظ کی لغت ہی مختلف ہو جاتی ہے ضرور کوئی روحانی قلبِ ماہیت ہے بہر حال دلچسپ اور خوبصورت مطالعہ ہے۔''

[پسر دہقان، ص۵۶]

حرم پاک میں حاضری کے مناظر روحانی قلبِ ماہیت کے پرتو نظر آتے ہیں جس کی طرف پروفیسر قریشی نے اشارہ کیا ہے پہلا ہی منظر بڑا کیف آفریں اور روح پرور دکھائی دیتا ہے:

''بابِ ابراہیم (علیہ السلام) سامنے تھا داخل ہوئے۔ کعبہ پر پہلی نظر پڑی' زبان گنگ ہو گئی' دل میں پہلے بے شمار خیالات پیدا ہو رہے تھے' مگر اب خاموش ہو گئے۔ صرف دو منٹ ہی کعبہ کا دیدار کیا ہو گا کہ تہجد کی تکبیر شروع ہو گئی۔ نیت باندھ لی۔ نظریں کعبہ پر' کان امامِ کعبہ کی قرأت پر' دل حاضر خدائے واحد کی طرف' اتنی یکسوئی اور اطمینانِ قلب زندگی بھر کبھی نصیب نہ

ہوا تھا۔ مقام ہی ایسا تھا جس کے لیے عرصہ سے آرزو کرتا چلا آ رہا تھا۔ خدائے پاک نے ہمیں اس دربار میں حاضر ہونے کی سعادت بخشی تھی۔ وہاں سے منظوری نہ ملتی تو کہاں یہ بندہ اور کہاں مسجد حرام میں پہلا قیام۔ وہ بھی تہجد کے وقت 'تا نہ بخشد خدائے بخشندہ'۔'' {پسر دہقان، ص۴۵، ۴۶}

اس وقت سورۃ فجر کی تلاوت سنتے ہوئے 'وھذا البلد الامین' کے الفاظ کا سرور انھیں اپنی روح میں اترتا ہوا محسوس ہوا:

''جذب و مستی میں کچھ معلوم نہ ہو سکا، تلاوت کہاں سے کہاں تک ہوئی، رکعتیں کتنی ادا ہوئیں مجھے اپنا وجود تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوا اور اپنے آپ کو صفر اور منفی صفر ڈگری تک جاتے ہوئے محسوس کیا۔ ربِ کریم کے حضور کھڑے اپنی قیمت بے حد کم سے کم معلوم ہو رہی تھی کسی رکعت میں قراءت ہو رہی تھی..... **وَھٰذا البلد الامین** یہ سورۃ عموماً پہلے بھی نمازِ فجر میں سنا کرتے تھے لیکن وہ سرور نہ لیا تھا جو آج خاص طور پر لفظ 'ھذا' سے حاصل ہوا۔ کان میں لطف' دل میں لطف' بیت اللہ میں لطف' کعبہ میں اس آیت کے اس لفظ کو بڑے زور سے پڑھتے ہیں جو کچھ محسوس ہوا نوکِ قلم پر لانا بڑا ہی دشوار ہے ان الفاظ میں پہلے ذرا نرمی محسوس کی جاتی تھی آج اس میں بڑی گرمی محسوس ہوئی۔''

[پسر دہقان، ص۴۶]

مصنف کو اپنی بیوی کے ساتھ بڑی محبت تھی اس کی بیماری اور پھر موت نے جذباتی صدمہ پہنچایا اور اپنی وفا شعار بیوی 'رضیہ بیگم' کی کمی انھیں زندگی کے ہر موڑ پر محسوس ہوئی اپنی مرحومہ بیوی کا ذکر بڑی محبت سے اور سادہ الفاظ میں اس طرح کرتے ہیں:

''۴۲ سالوں کی رفاقت میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ روٹھ کر میکے چلی گئی ہو۔ خدا نے میری عزت جو کچھ بھی بنائی۔ اس میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ گھر میں جتنے مہمان آ جائیں۔ آندھی ہو یا بارش، رات ہو یا دن ڈھلے کی گرمی کبھی مہمان کو محسوس نہیں ہوا..... کہیں جانا ہو خواہ جتنا سویرے کبھی ناشتے کے بغیر نہیں بھیجا..... لیکن میرے گھر خدا کی مہربانی سے ہمیشہ ناشتہ چائے لسی ہمارے ٹائم ٹیبل کے پابند ہوتے نہ کہ ہمارا ٹائم ناشتہ وغیرہ کا پابند ہوتا۔ ڈیرہ پر دوستوں سے گپ شپ چل رہی ہوتی۔ مجھے خیال ہی نہ رہتا کہ گھر میں کچھ پکانے کو بھی ہے کہ نہیں مرحومہ کو میری عادت کا پتہ تھا لہٰذا خود انتظام کر لیتیں۔ برادری کی خوشی غمی میں شمولیت کے لیے ہمیشہ میرے ساتھ ہوتیں۔ کبھی کسی کو احساس نہیں ہوا کہ وہ ان پڑھ ہیں یا پڑھی لکھی لباس، چال ڈھال، اندازِ گفتگو سے سب احباب یہی سمجھتے رہے کہ پڑھی لکھی خاتون ہیں حالانکہ سکول کا منہ نہیں دیکھا تھا۔''

[پسر دہقان، ص۱۸]

اندازِ بیان سادہ بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اپنی شادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس وقت میری عمر ۱۶ سال تھی اور آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ یوں احباب کے ساتھ گپ شپ میں اپنے آپ کو پیدائشی شادی شدہ کہتا۔''

[پسر دہقان، ص ۱۸]

چنیوٹ کے ایک بزرگ سے ملاقات کا دلچسپ واقعہ بھی مصنف کو یاد ہے جس نے انھیں حیران کر دیا تھا:

''۱۹۸۲ء میں چنیوٹ میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی وہ بولتا نہیں تھا، لکھ کر جواب دیتا رہا میں ساتھ ہی پڑھتا گیا۔ میں نے اپنی بیوی کی بیماری کے متعلق جو کچھ پوچھا اس نے چھپا کر لکھا۔ پھر سلیٹ کی دوسری جانب خانے بنا کر انگلی رکھوائی جو میں نے اتفاق سے خانہ نمبر تین پر رکھی الٹا کر دیکھا تو لکھا تھا تم نے خانہ نمبر تین پر انگلی رکھی ہے اور آگے پوری تفصیل میں میرے سوال کا جواب درج تھا۔ حتیٰ کہ میرے گھر والوں کا نام بھی درج تھا۔''

[پسر دہقان، ص ۳۶]

محکمہ مال گزاری سے گہری دلچسپی کے باعث 'ارضی' حوالے اور خسرے اور کھتونیاں بار بار یادداشتوں میں در آتی ہیں مربہ نمبر' کلہ نمبر' موگھہ نمبر اور چک نمبر قاری کو چکرا کر رکھ دیتے ہیں یہ نمبر گیم اگر نہ ہوتی تو اس میں شک نہیں کہ تاثیر دو چند ہوتی اس کے علاوہ زندگی کے واقعات میں ربط و تسلسل کا فقدان ہے۔ واقعات دلچسپ اور نصیحت آموز بھی ہیں ایک موضع کہ نول برادری ہی وہاں کے زمیندار ہیں۔ پرانے دور میں برادری کی ایک قل خوانی پر گئے۔ ہر چند کار میں سوار تھے، پروفیسر سمجھ کر نظر انداز کیے گئے کہ پٹواری یا شوگر مل کلرک بھی ہوتے تو کوئی بات بھی تھی، پھر جب کسی نے ان سے پوچھ لیا کہ آج کل کیا کر رہے ہو تو مصنف نے یہ کہہ کر حساب برابر کر دیا:

''.....سونا بناتا ہوں سب نے بڑی توجہ دی کہ وہ تو مجھے شریف آدمی سمجھتے تھے آخر یہ ہوئی نا بات! کار ایسے تھوڑی خریدلی ہے، کئی سوال ہوئے کتنا بناتے ہو میں نے کہا دو سال کی محنت سے ایک آدھ ڈلی بنتی ہے، پوچھا گیا زیادہ کیوں نہیں، میں نے کہا 'خام مال' خالص نہیں ملتا، وہ کیوں، بتایا لوگ میٹرک پاس بیٹے میرے پاس بھیجتے ہیں۔ ان کی خوراک خالص نہیں ہوتی، واپڈا کے میٹر بند کر کے گندم کو پانی دیا جاتا ہے لوگوں کی فصل سے بھینس کو چارہ چوری کا کھلاتے ہیں، وہ دودھ پیتے ہیں، بے وضو بلکہ بے غسل مائیں ان کو دودھ پلاتی ہے میں قال اللہ و قال الرسول پڑھاتا ہوں جوان کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ وہ سونا نہیں بن سکتے۔''

[پسر دہقان، ص ۳۹]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ ''یادداشتیں'' اتنی مختصر ہیں کہ زندگی کے واقعات شذرات معلوم ہوتے ہیں ان میں ربط و تسلسل کا فقد ان دکھائی دیتا ہے اور اس کے علاوہ اس میں کچھ ایسی باتیں بھی در آئی ہیں جن سے قاری کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جیسا کہ مواضعات سے متعلقہ تفصیل وغیرہ، ان کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مصنف اپنی یاداشت اور معلومات کے اظہار میں خودنمائی کی طرف مائل ہے۔

'بیتے لمحوں کی چاپ' پروفیسر سمیع اللہ قریشی کی آپ بیتی ہے دیباچہ کے عنوان سے ایک طویل غزل میں اپنی داستان حیات کا منظوم خلاصہ دینے کی کوشش کی ہے آخری شعر دیکھئے:

لا یا تو ہوں تلاش کر لمحوں کے نقشِ پا
کہتے رہیں گے لوگ، فسانہ طراز تھا

آغاز اتنے دلچسپ انداز میں کیا ہے کہ اس پہ کسی افسانے کا گمان ہوتا ہے:

''میں کسی آہٹ پر چونک کر جاگ پڑا۔ رات کا آخری پہر ہو گا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ باہر ملگجا سا سویرا لگ رہا تھا۔ میں اُٹھ بیٹھا تو میں نے دیکھا باہر صحن میں میرا چھوٹا بھائی پاؤں پاؤں چلتا جا رہا ہے میں نے گھبرا کر اپنی ماں کو آواز دی 'بی بی کا کا باہر نکل گیا ہے' والدہ ہڑ بڑا کر اٹھیں اور لپک کر صحن میں جا کر انھوں نے کاکے کو گود میں اٹھا لیا۔ امان اللہ صرف دس گیارہ ماہ کا تھا، اور چلنے لگا تھا۔ میری عمر کوئی چار برس کے لگ بھگ ہوگی میں نے دیکھا چارپائی کے ساتھ گنوں کے چھلکوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جب ہم سو گئے ہوں گے تو امی ابا دیر تک گنے کھاتے رہے ہوں گے۔ بہت سوچتا ہوں تو پہلی یہی بات نظارہ بن کر میرے سامنے آتی ہے۔''

[بیتے لمحوں کی چاپ، ص۹]

پنجاب کے ان شہروں میں جہاں آج ہمیں کبھی کبھار کوئی مندر دکھائی دیتا ہے اور ذہن اس وقت میں کھو جاتا ہے جب یہاں ہندو اور سکھ بھی گھل مل کر رہتے تھے۔ اس عہد کی تہذیب اور ثقافت کی جھلکیاں اس آپ بیتی کے ابتدائی صفحات پر با آسانی تلاش کی جا سکتی ہیں جن میں ہمیں ہندو اور کشمیری مسلمان مل کر چوسر اور بارہ ٹہنی کھیلتے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں لمبی ڈاڑھیوں والے سکھ بھی دکھائی دیتے ہیں:

''مجھے جب بھی دونی چونی ملتی تو میں اپنی پسند کی مٹھائی برفی لینے شہر کے بڑے کنویں کے پاس چونی لال حلوائی کی دکان پر جایا کرتا تھا۔ یہ کھلی جگہ دراصل بستی کی اجناس کی منڈی تھی یہاں ہندو، مسلمان آڑھتی گڑ، شکر، تمباکو، بکئی، دالیں، چنا، گندم اور بہت سی دوسری اشیاء کی بوریوں کی اوٹ میں بیٹھے حقے گڑگڑا رہے ہوتے یا چوسر اور بارہ ٹہنی کھیلتے نظر آتے تھے۔ قریب ہی ایک بہت چھوٹے کمرے میں کسی مورتی کے سامنے کوئی لمبی بودی والا ہندو پراتھنا کرتے ہوئے بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آتا تھا۔ بازار کے شروع میں سبزی وغیرہ کی ایک بڑی دکان تھی بستی کے کشمیریوں کی اور اس سے ملحق آٹا پیسنے کی چکی تھی؛ جس میں اس کا مالک غفور پٹھان آٹے میں اٹا ہوا کھڑا نظر آیا کرتا تھا جس روز کی بات مجھے یاد آ رہی ہے۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ کنویں کے آس پاس اور منڈی کی کھلی جگہ میں بے شمار سکھوں کا ایک جلوس ہے، ان کے درمیان اونچے تخت پوش پر ایک سکھ لڑکا گرنتھ صاحب پر سفید بالوں والے مورچھل سے پنکھا کر

رہا تھا۔سکھ مل کر کوئی گیت گا رہے تھے۔''

[بیتے لمحوں کی چاپ،ص۱۵]

مصنف نے اپنے بچپن کی دلچسپ باتیں اور واقعات بھی نقل کیے ہیں اور وہ قصے بلا جھجک لکھ دیئے ہیں جن میں بچپن کی ایسی شرارتیں شامل ہیں جو اس زمانے میں کسی کی دل آزاری کا باعث بنیں اور بعد میں مصنف کو اس پر ندامت محسوس ہوئی مگر باوجود خواہش اور کوشش کے اس کے ازالے کا موقع نہ مل سکا:

''.....سیلون سے آیا ہوا ایک بوڑھا بچوں کے لیے بسکٹ،ٹافیاں اور میٹھی گولیاں شیشے کے مرتبانوں میں ڈال کر بیچا کرتا تھا۔وہ غریب اُردو بھی صحیح نہیں بول سکتا تھا.....میرے پاس ایک کھوٹی اٹھنی تھی جسے کوئی دکاندار قبول نہیں کرتا تھا۔آخر میں نے بہت سوچ بچار کے بعد اس سیلونی کے ساتھ دھوکہ کرنے کا پلان بنایا۔ چنانچہ میں نے اسے کہا مجھے چونی کی میٹھی گولیاں دے،اس شریف آدمی نے مجھے بہت ساری گولیاں بھی دے دیں اور ایک صحیح سالم چونی بھی تھما دی میں یہ سب کر کے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔افسوس صد افسوس اس پر مجھے خیال بھی آیا کہ میں اس غریب غیر ملکی بابا جی کو کھری اٹھنی،جب عید کے موقع پر مجھے ملے گی تو دے آؤں گا،مگر پھر جب میں اٹھنی لے کر گیا تو وہ دکان ہی ختم ہو چکی تھی۔''

[بیتے لمحوں کی چاپ،ص۲۵]

اسی طرح چنیوٹ میں دریائے چناب کی پل پر سیر کے دوران ایک مزے دار واقعے کا بھی ذکر کیا ہے' جس کو پڑھ کر لطف بھی آتا ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے:

''ایک روز ابا جی امی اور ہم سب بچوں کو لے کر دریائے چناب پر سیر کے لیے لے گئے ریلوے لائن سے ہم لوگ نیچے اترے تو آگے ایک پہاڑی کی چوٹی تک سیڑھیاں جاتی تھیں۔ہم سب اوپر پہنچے تو سامنے ایک چھوٹا سا ہوادار کمرہ تھا جس میں ذرا اونچائی پر رکھی ہوئی پتھر کی ایک سل پر سنگ مرمر کا انسانی جسم کے برابر فرش نشین بت پڑا ہوا تھا یہ بت بہت ہی خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔اس کا بازو غائب تھا ساتھ ہی ایک کھڑکی کھلتی تھی جہاں سے دریا کا پانی بہت گہرائی میں اس چٹان سے ٹکراتا ہوا آگے پل کی طرف جا رہا تھا۔پتہ نہیں کیسا ایمانی جوش ابا جی کے دل میں تلاطم پیدا کرنے لگا۔کہنے لگے ہمارے پاک وطن میں اب بتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں آؤ مل کر اسے اٹھائیں۔اور دریا میں پھینک دیں۔میں بھی ان دنوں نسیم حجازی کے دو تین اسلامی تاریخی ناول پڑھ کر جہادی جذبوں سے سرشار رہتا تھا۔فوراً ہی اس نیک کام کے لیے تیار ہو گیا،پوری آواز سے ابا جی نے نعرہ تکبیر،اللہ اکبر کہہ کر دونوں بازوؤں میں بت اٹھا لیا.....اور کھڑکی کی راہ سے اسے دھڑام سے دریا میں پھینک دیا۔''

[بیتے لمحوں کی چاپ،ص۹۴]

مگر بعد میں مصنف کو اپنے اور اپنے اباجی کے اس رویے پر تشویش ہوئی کہ مرمر کا وہ بت تراشنے پر کتنی محنت صرف ہوئی ہوگی، اور جانے کس عقیدت سے کسی ہندو گرو نے اپنی عبادت گاہ میں تسکین قلب کے لیے اسے نصب کرایا ہوگا یہ بت رہ جاتا تو اس بات کا امکان تو تھا کہ ہمارے ہی وطن کے ہندو یاتری اپنے بھگوان کے آگے ماتھا ٹیکنے آتے۔ اور دلی خوشی حاصل کر کے واپس لوٹ جاتے۔

سادہ اور رواں انداز، دلچسپ واقعات، اور عمدہ منظر نگاری اس آپ بیتی کے امتیازی اوصاف میں سے ہیں مصنف نے بچپن کا ایک واقعہ اس انداز میں بیان کیا ہے کہ بچپن کی معصومیت پر پڑھنے والے کے ہونٹوں پہ چپکے سے مسکراہٹ بکھر جاتی ہے:

> ''.....اس زمانے میں مجھے دو مسلمان شخصیتوں سے بہت لگاؤ تھا اورنگزیب عالمگیر اور ٹیپو سلطان میں نے اپنی سوچ سمجھ اور مطالعے کے بل پر ان دونوں شخصیات پر بزعمِ خود کتابیں لکھنا شروع کر دیں۔ عبدالرحمٰن ایک خوش نویس طالب علم تھا۔ میں دونوں کی تصویریں بھی ساتھ چپکانا چاہتا تھا ٹیپو سلطان کی تصویر تو میرے پاس موجود تھی مگر عالمگیر کی تصویر کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ہمارے کلاس روم میں دیواروں پر جو تصویریں آویزاں تھیں ان میں اورنگزیب عالمگیر کی تصویر بھی تھی، بس پھر میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اسے کیسے حاصل کیا جائے چھٹی کے وقت ہمیں کہا جاتا تھا کہ اپنے اپنے کمرے کی کھڑکیاں بند کر کے جائیں، ایک روز میں نے اپنے قریب کی کھڑکی کو بند تو کر دیا مگر چٹخنی نہیں لگائی، شام کو میں ایک لمبی پتلی بانس کی چھڑی لے کر گھر سے نکلا اور سکول آ گیا، ادھر ادھر دیکھ کر میں نے کھڑکی کو دھکا لگایا وہ آسانی سے کھل گئی اور میں اندر داخل ہو گیا چھڑی سے میں نے عالمگیر کی تصویر کو جھٹکا دیا تو وہ نیچے گر گئی میں نے تصویر کو لپیٹ کر بغل میں دبا لیا اور چھڑی لے کر بھاگ نکلا۔''

[بیتے لمحوں کی چاپ،ص۹۶]

مصنف کے دوستوں، ساتھیوں اور افراد خانہ کی یادگار تصاویر بھی اس میں شامل ہیں اس کے علاوہ دوران ملازمت ادبی شخصیات کے ساتھ منعقد ہونے والی اہم سرکاری و غیر سرکاری تقریبات کی رنگین یادگاری تصاویر سے بھی اس کو مزین کیا ہے۔ اس کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں قادیانیت کی ابتدائی تاریخ کے حوالے بھی موجود ہیں۔ قادیانیت کے بتدریج فروغ کی داستان بھی ہے، احمدی جماعت کی مخصوص اصطلاحات اور لفظیات سے بھی آگاہی دی ہے:

> ''زیادہ تر انھی محلوں میں احمدی جماعت کی سرگرمیاں کسی نہ کسی شکل جاری رہتی تھیں، میں بچپن میں بھی اطفال کی تنظیم کا رکن نہیں رہا۔ نوجوانوں کی تنظیم خدام کہلاتی تھی، جن کا فوجی انداز کا سالانہ اجتماع نواب محمد علی خان آف مالیر کوٹلہ کی کوٹھی کے سامنے والے میدان میں ہوتا تھا.... چالیس سال سے اوپر کے لوگ انصار کہلاتے تھے۔ یہ انھی مجالس میں مرزا صاحب کی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ عورتوں کی 'تنظیم لجنہ' کہلاتی تھی، جس کے باقاعدہ اجلاس ہوتے تھے کبھی

کبھی میری والدہ بھی ان میں شریک ہو کر مرزا صاحب کی کوئی نظم یا نعت خوش الحانی سے پڑھا کرتی تھیں۔''

[بیتے لمحوں کی چاپ، ص۳۳]

اس آپ بیتی میں شخصیت نگاری کا عنصر خوبصورتی سے سامنے آتا ہے۔مصنف کے دوست احباب کے ذکر میں شخصیت نگاری اور سراپا نگاری دونوں کی جھلک ایک ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے:

''پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف بچوں کی نفسیات کے استاد تھے۔خوب بنے ٹھنے کالج آتے وہ بھی سرخ ٹائی لگاتے تھے مگر ایسے لگتا تھا جیسے وہ چاہتے ہیں کہ اپنے کلاس روم رویے میں اپنے طالب علموں کی سطح پر اتر آئیں۔لیکچر دیتے ہوئے کبھی کبھی وہ روسٹرم چھوڑ کر تھڑے پر بیٹھ جاتے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ کلاس میں داخل ہوتے ہی پنجابی میں کہتے 'او بھئی بھاٹی دروازے فلانی فلم لگی ہوی اے نئیں ویکھی تے ضرور ویکھو' پروفیسر صاحب امرتسر کے رہنے والے تھے۔ہر اعتبار سے امرتسری دکھائی دیتے تھے لاہور آ کر اب جو لاہور کا پانی ان پر چڑھ چکا تھا تو وہ اس پر مستزاد تھا۔وہ مشہور لمبی ڈاڑھی والے اہل حدیث مسلک پر کاربند صحافی علامہ حسین میر کاشمیری کے فرزند تھے۔''

[بیتے لمحوں کی چاپ، ص۱۲۶]

اس آپ بیتی کو پڑھتے ہوئے یہ احساس شدت اختیار کر جاتا ہے۔کہ کسی ناکردہ گناہ کے احساس نے اس کی ضخامت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس کا اسلوب بھی مدافعانہ بنا دیا ہے لیکن اس کتاب میں جذباتی عنصر اسی احساس کے طفیل داخل ہوا ہے اس کے علاوہ، اس کی ایک نمایاں بات خود کو ممیّز کرنے کی دانستہ کوشش ہے 'وہ میرے بارے میں کہتے ہیں' کہہ کر طویل خط' وضاحتی کالم' قرارداد تحسین وغیرہ شامل کر دیتے ہیں جو اس کے تقریباً ایک تہائی حصے تک پھیل جاتے ہیں۔جس کے باعث یہ آپ بیتی، مدح سرائی کے زمرے میں داخل ہو جاتی ہے جس سے گراں باری کا احساس بڑھ جاتا ہے اگرچہ مصنف کی ذاتی زندگی کے احوال البتہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔یوں ''بیتے لمحوں کی چاپ'' میں مصنف کی 'چاپ' 'دھمک' کی شکل اختیار کر کے مرعوبیت کی اقلیم میں داخل ہونے کی کامیاب کوشش کہی جا سکتی ہے۔

'جیون دھارا' {کیکر کی چھاؤں سے کمشنر ہاؤس تک} مہر جیون خان' کی آپ بیتی ہے 'جیون ندیا بہتی جائے' کے عنوان سے مصنف کا تعارف کراتے ہوئے اس کتاب کے آغاز میں خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

''جیون خان ایک ممتاز بیوروکریٹ رہے ہیں۔ان کا آبائی تعلق ضلع جھنگ کے ایک پس ماندہ گاؤں سے ہے، جہاں ان کے باپ دادا ایک متوسط درجہ کے زمیندار تھے.....کیکر کی چھاؤں میں کھری چارپائی پر بیٹھنے اور رہٹ کی روں روں کے غیر مرئی گیت سننے والا، جیون نام کا یہ نوجوان انتہائی لائق ثابت ہوا اور غیر معمولی تعلیمی کریئر کی وجہ سے اپنے ہم جماعتوں میں ہمیشہ ممتاز رہا یہ اس کی سخت محنت، قابلیت اور مستقبل بینی کا ثمر تھا کہ وہ پہلی کوشش میں سی

۔ایس۔پی ہوگیا۔اور دوسری کوشش میں ڈی۔ایم۔جی جیسے باوقار گروپ کے لیے منتخب کرلیا گیا..... یہ نوجوان افسر تربیتی مراحل کو خوش اسلوبی سے طے کر کے مختلف عہدوں پر طرح طرح کے فرائض انجام دے کر ایک دن ڈپٹی کمشنر کے عہدۂ جلیلہ پر سرفراز ہوا جو سی۔ایس۔پی افسروں کے لیے انعامی عہدے کی حیثیت رکھتا ہے پھر درجہ بدرجہ کمشنر، صوبائی سیکرٹری کے اہم عہدوں پر فائز رہا اور آخر میں ممبر صوبائی پبلک سروس کمیشن کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے بعد بڑے وقار سے سبکدوش ہوا اس نے ان عہدوں پر ہمیشہ دیانت اور محنت سے کام کیا انصاف اور مفادِ عامہ کے تقاضے ملحوظ رکھے، اور منصب کو خدمت کا وسیلہ جانا۔''

[جیون دھارا، ص ۷]

اس کتاب میں کئی ذیلی عنوانات دیئے گئے ہیں جوں جوں زندگی کا دھارا آگے بڑھتا جاتا ہے ساتھ ساتھ عنوان بدلتے جاتے ہیں۔آغاز اس طرح کیا ہے لگتا ہے کہ پریم چند کا افسانہ پڑھ رہے ہیں:

''کیکر کا بڑا درخت، بہتا ہوا صاف ستھرا پانی جو تھوڑی دور واقع کھیت کو سیراب کر رہا ہے رہٹ کی سریلی مدھر راگنیاں، بیل کے گلے بندھی گھنٹی کی آواز ٹنڈوں سے پرنالہ میں گرتا ہوا پانی ۔درخت کے سایہ تلے کھردری سی چارپائی جس پر ایک بھاری بھرکم دہقان بیٹھا ہوا حقہ پی رہا ہے بڑھاپے نے آلیا ہے، ہمت البتہ جوان ہے نہ بے کار ہے نہ ناکارہ۔اس کے دم سے ڈیرہ آباد ہے۔جانور جو قریب ہی بندھے ہیں، محفوظ ہیں بہت سی چیزیں اس کی تحویل میں رہتی ہیں مثلاً لسی کا کٹورا، دودھ بھری گاگر، خالی برتن جنہیں اس کی بہوئیں کام دھندے سے فارغ ہو کر گاؤں میں واقع گھر لے جائیں گی، ایک کمسن بچہ اسی ساز و سامان میں شامل ہے ماں اسے ساتھ لائی ہے وہ ہل چلانے والوں کا ناشتہ سر پر اٹھائے کھیتوں کی طرف چلی گئی ہے فارغ ہونے پر وہ اپنی بھینسوں کی سیوا کرے گی۔ظاہر ہے اس دوران لاڈلے بیٹے کا ماں سے چپکے رہنا، کارِ جہاں کو منظور نہیں حل یہ نکالا گیا کہ اسے آتے ہی دادا کے حوالے کر دیا جائے۔''

[جیون دھارا، ص ۱۴]

کہیں کہیں پنجابی الفاظ کی آمیزش جدا مزا دیتی ہے اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس جگہ اگر پورا جملہ اردو میں لکھا ہوتا تو مفہوم اس طرح واضح نہ ہو پاتا:

''بابا کی بَھینی ☆۲ جھوکوں سے ملحقہ سرِ راہے واقع تھی۔کھال کی پٹڑی چوروں کی راہ گزر تھی۔سردیوں میں اکثر واہر ☆۳ پار ٹیاں کُھرے اٹھائے نہ صرف یہاں سے گزرتی تھیں بلکہ کھوجی ان سے صلاح مشورہ بھی کرتے تھے۔ان کے گویڑ (قیافے) کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی کئی دفعہ تو بابا

چوروں کی یوں حتمی نشاندہی کر دیتا کہ واہر کھرے کو چھوڑ کر سیدھی ان کے گھر پہنچ جاتی اور وہ مال سمیت پکڑے جاتے۔ کئی ایک بعد میں گلہ کرنے بھی آتے۔ بابا انھیں حقہ پیش کرتے لسی سے تواضع کرتے اور برملا کہتے ''بھئی میں سادھ کا بیلی (ساتھ دینے والا) ہوں۔''

[جیون دھارا، ص ۱۷]

مصنف کی زندگی کی طرح انداز بیان میں سادگی نمایاں ہے۔ اپنے لیے مٹی کا مادھو، اللہ میاں کی گائے، جیسی سرخیاں بھی استعمال کرتے ہیں۔ جو بات جتنی سادہ تھی اسی طرح بنا کسی لگی لپٹی کے پیش کر دیا ہے، مٹی کا مادھو، کے عنوان سے اپنے بچپن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''گہرے کالے بادل یوں بھی اسے اچھے لگتے تھے۔ جب وہ چھما چھم برستے تو وہ گم سا ہو جاتا جی چاہتا کہ برستے ہی رہیں رونا بھی ایک طرح اسے اچھا لگتا تھا آنسو اندرونِ خانہ پڑی گرہیں کھول دیتے تھے کدورت کے سب داغ دھل جاتے ستانے والوں کے خلاف عداوت کی پرچھائیاں تک نہیں رہتی تھیں۔ اس کا نام ہی ''روندو'' پڑ گیا تھا۔ مڈل سکول میں آنے کے بعد البتہ وہ سنبھل گیا تھا، بورڈنگ ہاؤس کے نشیب و فراز نے بہت سے بل نکال دیئے تھے۔ اسے اب یہ قطعاً منظور نہیں تھا کہ دوسروں کے سامنے آنکھیں نم ہوں اس حد تک وہ اپنے اوپر قابو پا چکا تھا، پرائمری سکول میں تو وہ آدھا وقت رونے دھونے میں گزارتا تھا ..... صبح سویرے تختیاں اور بستے اٹھائے بیس بائیس بچے سکول کے لیے روانہ ہوتے۔ راستے میں اگر کوئی حادثہ نہ بھی ہوتا تو کوئی کہہ دیتا 'دیکھو وہ رو رہا ہے' سبھی کورس کے انداز میں گاتے 'روندو رو رہا ہے' اور وہ سچ مچ رونے لگتا۔''

[جیون دھارا، ص ۳۵]

مصنف کے باپ کا اسے سکول بھیجنے کا 'فتویٰ' جس جواز پر مبنی تھا اس کا ذکر سنئے:

''اپنی ناک تو اس سے پونچھی نہیں جاتی کاشتکاری کیا کرے گا۔ کیا معلوم چار اکھر پڑھ کر بخت لگ جائیں اور پٹواری بن جائے' یوں وہ کیکر کے سایہ اور بابا کی دوستی سے محروم ہو کر سکول سپرد ہو گیا۔''

[جیون دھارا، ص ۳۷]

گورنمنٹ کالج جھنگ میں اپنے گزرے وقت کو یاد کرتے ہوئے اپنے اساتذہ کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں:

''آدھیوال میں پڑھنے والوں کے بھاگ اچھے تھے کہ انھیں کئی ایک اچھے استاد ملے، کئی ایک کا ذکرِ خیر پہلے ہی آ چکا ہے، پروفیسر محمد سلیم اور جناب تقی الدین انجم کے اسمائے گرامی کے بغیر حکایت ادھوری رہ جائے گی۔ انجم صاحب قادر الکلام شاعر ادیب اور دانشور تھے۔ نیکی ذہانت اور وسیع القلبی کا ایسا امتزاج کم ہی دیکھنے میں آیا تھا پروفیسر محمد سلیم اسلامیات پڑھاتے

تھے۔مطالعہ بہت وسیع تھا۔زبان سے پھول جھڑتے تھے۔روانی ایسی کہ ہولے سے چلے بادِ نسیم لیکچر کے دوران سماں سا بندھ جاتا کسی شاگرد میں روشنی کی کرن دکھائی دیتی تو گل فشانی سے یوں حوصلہ بڑھاتے کہ وہ پھولے نہ سماتا،اوروں کو اچھا بننے کی ترغیب ہوتی کبھی کبھی تو اندازِ دلربائی آسمان کو چھونے لگتا۔''

[جیون دھارا،ص۶۱]

مناظر فطرت میں ڈوب جانے اور چابکدستی کے ساتھ ان کی منظر کشی کا ہنر مصنف کو خوب آتا ہے۔اور ایسے لگتا ہے مصنف نثر میں شاعری کرنے لگا ہے:

''بنگال کا حسن و جمال جادو اثر تھا سبزہ اور پانی کا اس سے خوبصورت ملاپ کہیں کم ہی ہوگا۔اٹھلاتی ہوئی مست خرام ندیاں بل کھاتی ہوئی،لہراتی ہوئی،رواں دواں دونوں جانب ہرے بھرے کھیت،جن میں اتنے پیڑ ہوتے کہ جنگل کا گمان ہوتا۔ندی کے کنارے اُگے بانس اور ناریل کے جھنڈ بہتے پانی میں اپنا عکس دیکھنے لگتے۔ہر سو پھیلی شاخوں کے درمیان پگڈنڈیاں ندی میں اترتی دکھائی دیتیں۔گاگریں کمر پر دھرے ناریاں ندی کنارے آتیں۔پانی بھرتیں اور سبزے کی دیوار کے پیچھے چھپ جاتیں۔''

[جیون دھارا،ص۱۰۸]

بنگال کے حسین مناظر کی خوبصورتی میں مصنف کا طرز بیان اور بھی رعنائی پیدا کر دیتا ہے،مصنف کے ساتھ قاری بھی ان مناظر میں دیر تک کھویا رہتا ہے:

''دو اور مقامات کی یاترا ابھی ذہن پر نقش ہے۔کھلنا سے سندر بن اور چٹاگانگ سے کپتائی لانچ ندی کی لہروں پر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی کوئی دو گھنٹے میں سندر بن کے قریب پہنچتی تھی،موسم کھلا تھا ندی معمول سے زیادہ بھری تھی اور قریبی سمندر میں جوار بھاٹا زوروں پر تھا۔لانچ زبردست ہچکولے کھا رہی تھی۔جنگل میں داخل ہوتے ہی ندی کئی شاخوں میں بٹ گئی۔ہم ایک چھوٹی شاخ میں چل رہے تھے مگر وہ بھی کنارے کنارے۔گھنا جنگل ہر سو پھیلا ہوا تھا کہیں کہیں تو گھپ اندھیرے سے گزرنا پڑتا تھا۔ہیبت کا عالم طاری تھا سکوت اور گہری خاموشی جس میں رنگ برنگ کے پرندوں اور جنگلی جانوروں کی آوازیں تک دب کر رہ گئی تھیں ہم سب اپنی اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھے دونوں طرف دیکھ رہے تھے۔فطرت کا تقدس خراج وصول کر رہا تھا۔جی چاہتا تھا کہ یوں ہی چلتے رہیں خراماں خراماں،آگے اور آگے ہوتے ہوئے سندر بن کے دل میں اتر جائیں۔فطرت سے ہمکنار ہو کر جاوداں ہو جائیں۔''

[جیون دھارا،ص۱۰۳]

ایک اور منظر دیکھئے:

''دوسرا سفر چٹا گانگ کا تھا۔ سڑک سے گئے۔ گہرے سیاہی مائل درختوں اور مخملی گھاس سے ڈھکا ہوا پہاڑی علاقہ۔ جگہ جگہ اچھلتی کودتی چھوٹی بڑی ندیاں، چھم چھم پڑتی بارش، جو پنجاب میں کبھی برسے تو چھاجوں پانی پڑنا کہلائے، بنگال کی سرزمین واقعی جنت نظیر ہے مگر اس پہاڑی علاقے کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ پہاڑ کے دامن میں جہاں دریا بہتا ہے وہاں تو واقعی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس منظر سے مسافر لطف اندوز ہو اور کس سے محروم رہے۔''

بعض جگہ اتنے خوبصورت اور بامقصد جملے لکھ جاتے ہیں جو ضرب المثل بن جانے کے قابل ہیں:

''اللہ کی بہت بڑی نعمتوں میں سے سرِفہرست نیک سیرت والدین اور اچھے استاد ہیں۔ جسے یہ دونوں مل گئے اس کے دونوں جہان سنور گئے۔ جو ان سے محروم رہا وہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔''

[جیون دھارا، ص ۶۰]

جیون خان، دورانِ ملازمت ملک کے مختلف حصوں میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ مختلف علاقوں میں عوام الناس کے ساتھ براہِ راست رابطے کی بدولت مصنف کو ہر طرح کے عوامی رویے دیکھنے کو ملے جن کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ بنگال کے باسیوں کے متعلق کہتے ہیں بڑے ہی پیارے لوگ تھے جذبات کی رو جدھر لے جاتی ادھر ہی بہہ جاتے ایک بار عید کے موقع پر راجباڑی کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:

پیارے بھائیو! میں آپ کا ایس ڈی او ہوں میرا گھر مغربی پاکستان کے ایک دور دراز ضلع کے چھوٹے سے گاؤں میں ہے..... میں نے چاہا کہ سارے بھائیوں کے ہمراہ اکٹھے نماز پڑھوں اور عید مناؤں کیا آپ میرے ساتھ دور سے آنے والے بھائیوں کا انتظار نہیں کریں گے؟ ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں بولے گئے ان جملوں کا توقع سے زیادہ اثر ہوا.....ادھر دعا ختم ہوئی ادھر گلے ملنے والے ٹوٹ پڑے جوتا تک نہیں پہننے دیا بیک وقت تین تین چار چار، بھائی چمٹتے رہے۔ عمر بھر کا حساب لگایا جائے تو اس ایک موقع پر عید ملنے والوں کی تعداد کل تعداد سے زیادہ بیٹھے گی۔''

[جیون دھارا، ص ۱۴۰]

اسی طرح کے مثبت اور منفی رویوں کے باعث مصنف نے ایک معاشرتی نقاد کا روپ بھی دھار لیا ہے:

''گاؤں ہوں یا قصبے اور شہر، تجاوزات بہت بڑا دردِ سر ہیں مفادِ عامہ کا صحیح معنوں میں نگہبان کوئی نہیں جس جائیداد کا مالک موقع پر موجود برابر پہرہ نہیں دے رہا ہے اس پر آج نہیں تو کل قبضہ ہو جائے گا اور پھر مالک کو اپنی جائیداد واپس لینے کے لیے طویل جنگ لڑنا ہو گی۔ جس میں چھوٹی بڑی عدالتیں، بھاری فیس لینے والے وکیلوں کے علاوہ پولیس، مال اور بلدیہ والوں سمیت کئی صاحبِ کمال لوگوں سے واسطہ پڑے گا، کمزور اور بے وسیلہ عوام کے

لیے اپنے حق کا تحفظ مشکل ہوتا جا رہا ہے۔''

[جیون دھارا، ص ۲۲۴]

صاحبِ کتاب کا مطالعہ کافی وسیع ہے اسلوبِ نثر میں فارسی، عربی الفاظ کا موزوں استعمال تو جا بجا موجود ہے۔ اس کے ساتھ فارسی اشعار کا استعمال عبارت کی دلآویزی میں اضافہ کر دیتا ہے سلطنتِ روما کے پایہء تخت روم جا کر وہاں کے لوگوں کی سلیقہ شعاری کے ذکر پر لکھتے ہیں:

''سڑک سے ذرا ہٹ کر خوبصورت درختوں میں گھرے کئی ایک جھونپڑے ایسے دلکش تھے کہ جی چاہتا دنیا کو تیاگ وہیں جا بسیں۔ چھوٹی سی اپنی دنیا ہو۔ چھوٹی سی بیوی، ننھے سے ایک دو بچے اور اللہ کا دیا اتنا کچھ کہ دال روٹی چل جائے۔ اپنی قسمت ایسی کہاں۔ وقت کی قید میں ہیں۔ لمحہ بھر کے لیے یہ تھمتا نہیں اچھی سی اچھی ہٹ (Hut) پل بھر میں آنکھوں سے اوجھل۔ خواب کا کیا ہے آنکھ کھلتے ہی تماشا ختم۔ تلخ حقیقت تو یہ ہے کہ نہ بیوی ہی سدا چھوٹی رہتی ہے نہ بچے ہی زیادہ دیر ننھے اور معصوم رہ سکتے ہیں بہار ہے تو اس سے لپٹ لپٹ جاؤ۔ جان لو کہ اسے جانا ہے اور وہ بھی تمہاری توقع سے پہلے، خزاں آئے گی تو اسے بھی گلے لگانا ہوگا..... حافظ لسان الغیب تھے۔ ٹھیک ہی کہا تھا ''چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند' (جو تھا وہ نہیں رہا جو ہے وہ بھی نہیں رہے گا)۔''

[جیون دھارا، ص ۲۵۸]

اشعار، کہاوتیں، مقولے اسلوب میں ادبیت کی شان پیدا کر دیتے ہیں۔ کھلنا میں گزرنے والی ایک شام کا منظر دیکھئے جس میں حسنِ فطرت اور حسنِ بیان دونوں عروج پہ دکھائی دیتے ہیں:

''کھلنا میں پٹ سن کے کارخانے کے ایک ریسٹ ہاؤس میں قیام تھا۔ دن تو دفتری کام میں نبڑ گیا شام ہوئی..... ٹہلنے کو جی چاہا۔ لان میں آیا تو بالکل سامنے دریا تھا۔ ادھر کو ہو لیا۔ دیکھا کہ لان سے پختہ سیڑھیاں دریا میں اتر رہی تھیں۔ جوتے اتار کر آخری سیڑھی پر جا بیٹھا پاؤں دریا کے پانی میں نگاہیں پانی کی سطح پر چلنے والی کشتیوں پر نظر اٹھائی تو کنارے کے اس پار ناریل کے گھنے جھنڈ دکھائی دیئے۔ عین اسی وقت ان کے پیچھے چودھویں کا چاند نکل رہا تھا۔ اپنے آپ کو بھول گیا۔ فطرت کا جوبن اس سے بڑھ کر نہیں دیکھا۔ کتنی دیر اس میں کھویا رہا کچھ معلوم نہیں پھر دور سے سیٹی بجنے کی آواز آئی۔ چونک کر آواز کے رخ دیکھا۔ دور سے سٹیمر آ رہا تھا۔ چاندنی میں نہاتے ہوئے ناریل کے لہراتے ہوئے درختوں نے اسے بھی اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ آج بھی چشمِ تصور سے وہ منظر دیکھ کر مسرت کی چند کلیاں چن سکتے ہیں انگریزی کے جواں مرگ شاعر کیٹس (Keats) نے واقعی سچ کہا تھا۔ ہر شاہکار حسن و جمال باعثِ مسرت

ِ جاودانی ہے۔‘‘

[جیون دھارا،ص۹۸]

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے سفر کی روداد جذبات نگاری کی عمدہ مثال ہے جس میں بے خودی کا عالم دکھائی دیتا ہے اسلوب نگارش کی فصاحت بھی جھلکتی ہے۔خانہ خدا کے سامنے جانے کے بعد کی کیفیتِ دل اس طرح بیان کی ہے:

''یاد نہیں کتنے طواف کیے کب سعی کی، کتنی بار حضرت ہاجرہ کی تقلید میں تیز دوڑے، کب کب حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔محویت کے عالم میں دن تمام ہوا......دو دن یونہی گزر گئے، کسک سی باقی رہی۔جیسے ساقی نے کچھ چھپا رکھا تھا۔ذوقِ گدائی شاید کم عیار تھا۔کانٹا دل میں چبھا گیا۔درد کا تحفہ دامن میں چھپائے مدینہ کو جالیا۔روضہ مبارک پر حاضر کیا ہوئے سارے بند ٹوٹ گئے ۔خانۂ کعبہ میں کئی بار چاہا تھا کہ آنکھیں تر ہوں مگر بوند تک نہیں ٹپکی تھی۔حضور کے ہاں پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ جھڑی لگ گئی اتنا پانی کب سے کہاں جمع تھا آنکھوں کا برسنا اچھا لگا۔دیر تک روتا رہا۔''

[جیون دھارا،ص۲۷۲]

اکثر جگہوں پر غالب اور اقبال کے نہ صرف اشعار درج کیے ہیں بلکہ نثر کے پیچھے بھی غالب اور اقبال کے مصرعوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

''(مانچسٹر میں) کورس ختم ہوا تو وہ (چودھری محمد بوٹا) لینے آ گئے ایک اور صاحب بھی ساتھ ہو لیے کافی گھمایا پھرایا۔ایڈنبرا تک ہو آئے اس کے گھر میں رکھی شہید ٹیپو سلطان کی تلوار اور زرہ بکتر دیکھ کر خون کے آنسو روئے ۔یونیورسٹیوں میں آوارہ بادل کی طرح تیرتے ہوئے بہت اچھا لگا پرانی درسگاہوں کی فضا میں کچھ ایسی خوشبو ہوتی ہے جو رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اور اک گونہ بے خودی محسوس ہوتی ہے مدہوشی سی چھا جاتی ہے.جی چاہتا ہے کہ فرصت کے دن ہوں وہیں کسی کونے میں چھوٹی سی کٹیا بنا لیں اور بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے۔ یہ ارمان نا آسودہ رہتے ہیں۔اس خواہش پہ دم نکلتا ہے، مگر زمانہ کس کس شوقِ آوارگی کی قدر کرے۔کاش کسی یونیورسٹی کے ہو کر رہ گئے ہوتے اور اگر یہ نہ تھی ہماری قسمت تو کسی سکول کو ہی گلے کا ہار بنا لیا ہوتا۔''

[جیون دھارا،ص۲۸۵]

آخر میں خواجہ محمد زکریا کی اس کتاب کے بارے میں رائے جو اس کے آغاز کے علاوہ اختتام پر ایک بار پھر کتاب کے فلیپ پر مصنف کی تصویر کے ساتھ نمایاں ہے:

''جیون دھارا ایک آہستہ خرام ندی کی طرح اپنا سفر پورا کرتی ہے......اس کتاب سے صاحبِ تصنیف کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک محنتی، متحمل مزاج، دیانتدار، ضابطہ پسند اور

خدمت گزار افسر کی جس میں افسری کی خو بو نہیں اور جو اقبال کے لفظوں میں سروری در دینِ ما
خدمت گریست پر عامل رہا۔''

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مصنف کے متعلق یہی تاثر سامنے آتا ہے کہ سب اچھا کہیں جسے، پر جیون ندی جتنی بھی پر سکون دکھائی دے اس میں بھنور بھی ہوتے ہیں اور بظاہر نہ دکھائی دینے والے مگر زیرِ آب چلنے والے سیلاب بھی۔ اس آپ بیتی کا کمزور پہلو اگر کوئی ہے تو یہی کہ اس میں کسی کمزور پہلو کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا آدمی فرشتہ نظر آنے کی کوشش کرے تو بقول شاعر:

ہر ایک شخص کو دعویٰ ہے پارسائی کا
سبھی فرشتے ہیں یارو کوئی بشر بھی ہے

اسی نوع کی آپ بیتیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس پر ایمان لانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے آپ بیتی سے متعلق اہم سوال اُٹھایا تھا کہ ''کیا کوئی شخص اپنی آپ بیتی لکھ سکتا ہے؟ شاید نہ لکھ سکے گا۔'' اپنے متعلق سچ لکھنے کا دعویٰ کرنا اور بات ہے لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ اسی لیے وہ آپ بیتی یا خود نوشت، سوانح عمری کی صنف کو دوسروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے مقابلے میں نارسا اور ناقص چیز قرار دیتے ہیں۔ اُن کے مطابق:

''اُس کے راستے میں دو بڑی رکاوٹیں ہیں دوسروں کا خوف اور اپنے آپ سے محبت۔۔۔
'اگر گویم زباں سوزد' کی عقوبت ہر ہر گام زنجیرِ پا بن جاتی ہے سچ کہنا یوں بھی مشکل ہے مگر اپنے متعلق سچ کہنا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔''[۵]

آلِ احمد سرور نے آپ بیتی کے فن پر بات کرتے ہوئے لکھا تھا:

''جینا ایک فن ہے اور آپ بیتی فنِ لطیف۔ اِس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بڑی سچائی، بڑے ریاض اور بڑے کھرے پن کی ضرورت ہے۔ اس کا راستہ بھی پل صراط کی طرح بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔''[۶]

ایک انتہائی مختصر مگر موثر آپ بیتی 'قصہ ایک درویش کا' کے نام سے سردار باقر علی خان نے پروفیسر سمیع اللہ قریشی کے ایما پر تحریر کی اور یہ گورنمنٹ کالج جھنگ کے مجلّہ کارواں میں شائع ہوئی، ان کا طرزِ تحریر نہایت دل پذیر اور دل آویز ہے، اپنے بچپن کے دور کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بچپن کی زندگی میں جن چیزوں نے میرے دل پر گہرے نقوش چھوڑے ان میں پہلی چیز شکار کا شغل تھا، اگرچہ شکار کھیلنے سے کہیں زیادہ حصہ میں شکار کھانے میں لیتا تھا۔ کونجیں، تلوریں بھٹڑ، تلیر، تیتر، بٹیر، مگھ سب عام تھے ہرن بھی عام تھے، نیچے دریا بہتا تھا اور مچھلی کی بھی کمی نہ تھی۔ دوسری چیز جس نے مجھے متاثر کیا وہ رات کے وقت سنائی جانے والی دلچسپ و دل پذیر طویل داستانیں تھیں جو سنانے والے ایک خاص انداز سے سناتے تھے اور آغاز کچھ اس طرح کرتے تھے، 'اگلے زمانے سچ کے تھے۔ تیرا میرا خدا بادشاہ' تیسری چیز وہ ڈھولے، ماہیے

اور گیت تھے جو دیہات میں نہایت میٹھے سروں میں گائے جاتے تھے، گاؤں کی وہ سہانی صبحیں، وہ دریا وہ ہوا، جیسے 'نسیمِ خلدمی وزد مگر زِ جوئے بارہا' وہ پرندوں کی بولیاں وہ بیلوں کی گھنٹیوں کی سدا، وہ دل ربا شامیں کیسے ممکن ہے کہ میں بھول جاؤں۔''

[قصہ ایک درویش کا، ص ۴۸]

سراپا نگاری کا انداز دیکھئے:

''ایک لیکچرار تھے ہمارے راج کمار تنخواہ غالباً پینسٹھ روپے ماہانہ تھی، (جو اس وقت بہت سمجھی جاتی تھی) لیکن لباس دیکھنے سے ہم خیال کیا کرتے تھے کہ شاید زیادہ خرچ لباس پر کرتے ہوں گے۔ بہت خوب صورت جوان تھے کم بولتے تھے انگریزی پڑھاتے تھے، زیادہ گھلنے ملنے سے اجتناب کرتے تھے۔''

[قصہ ایک درویش کا، ص ۴۹]

ایک اور سراپا ملاحظہ ہو:

''یہ وزیر آغا ہیں گورنمنٹ کالج جھنگ میں وزیر آغا صاحب ہمارے ہم مکتب تھے، مجھ سے ایک برس سینئر چپ چاپ خاموش، پیکرِ شرافت لیکن گمان یہ گزرتا تھا کہ مغرور ہیں ادیب بننے کا بہت شوق تھا، کالج کے دنوں کے بعد تو ہماری دوستی بھی ہو گئی تھی، مگر ان دنوں شاید ہی کبھی ہماری گفتگو ہوئی ہو۔''

[قصہ ایک درویش کا، ص ۴۹]

سردار باقر علی خان نے جس کا سراپا بھی لکھا ہے اس طرح لکھا ہے کہ چند ہی جملوں میں اس شخصیت سے دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں ،ان کی صاف گوئی بھی ان کی تحریر کا امتیازی وصف ہے، ڈاکٹر عبدالسلام کا خاکہ یوں بیان کیا ہے:

''ڈاکٹر عبدالسلام صاحب (نوبل پرائز والے) بھی ان دنوں ہمارے ہم مکتب تھے وہ مجھ سے جونیئر تھے پست قامت سے تھے ظاہری وقار سے محروم، میں ان کو ایک رٹے باز طالب علم سمجھتا تھا، لیکن میرا وہ خیال بھی غلط نکلا وہ آج ایک باوقار قد وقامت والا دنیا کا مانا ہوا لائق شخص ہے، معلوم ہوتا ہے میں اس وقت کوئی اچھا مردم شناس نہ تھا۔''

[قصہ ایک درویش کا، ص ۵۰]

آغاز کی طرح اختتام بھی نہایت دلچسپ اور دل نشیں ہے:

''عرصۂ دراز تک کام کرنے کے بعد ریٹائرڈ ہونے کے بعد اپنے گھر 1.F جھنگ میں قیام پذیر ہوں ملنے والوں کی تعداد اب کم ہو چکی ہے، کچھ بیمار بھی ہو گیا ہوں دوست چھوڑ چکے ہیں وہ

بھی جن پر جسم و جان سب کچھ نثار کیا..... حقے کا ساتھ بدستور ہے، اچھا مصاحب ہے اس نے عمر بھر ساتھ دیا ہے تنگ نہیں کرتا ہے بلاؤں تو بول پڑتا ہے ورنہ خاموش رہتا ہے، کچھ پاس ہو تو پیش کر دیتا ہے ورنہ منافق نہیں، جھوٹ نہیں بولتا بلا تردد کہہ دیتا ہے کہ خالی ہے کسی قابل نہیں ہمیشہ گھر پر بھی ساتھ رہا۔ سفر میں بھی دفتر میں بھی اور حد تو یہ ہے کہ کمرہ عدالت میں بھی اب معالج کہتے ہیں اسے چھوڑ دو میں اس زندگی بھر کے باوفا ساتھی کو کیسے چھوڑ دوں؟..... اس نے مجھے نہیں چھوڑا میں اسے کیسے چھوڑ دوں۔''

[قصہ ایک درویش کا، ص ۵۱]

جھنگ میں لکھی جانے والی آپ بیتیوں کے تجزیے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلحاظِ مقدار و معیار یہ کاوشیں اُردو نثر کی روایت میں بھلے بلند مقام کی حامل نہ ٹھہریں لیکن ان تحریروں میں جہاں ایک طرف مقامی تہذیب و ثقافت اور بولی ٹھولی کا رنگ ملتا ہے وہاں دوسری طرف ان میں ملی اور عصری شعور کے ساتھ ساتھ اُردو کی ادبی روایات کی پاس داری بھی ملتی ہے۔ ان کے ہاں اُردو ادب کے مرکزی دھارے میں شامل ہو جانے کی آرزو کا شدید احساس بھی ملتا ہے۔ جھنگ کے خودنوشت، سوانح نگار، آپ بیتی ایسے مشکل فن میں طبع آزمائی کرنے نکلے ہیں تو اُمید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل کے خودنوشت نویس اِس فن کی باریکیوں کا احساس رکھتے ہوئے زیادہ بہتر، مستند اور فنی لحاظ سے توانا آپ بیتیاں تخلیق کر سکیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد طفیل، تصریحات، نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، ۱۹۶۴ء

۲۔ شوکت تھانوی، مابدولت، ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، ص ۳۲-۳۱، ۱۹۴۹ء

۳۔ تبصرہ بعنوان بحرِ ذخار، مشمولہ: انوکھا لاڈلا، از محسن مگھیانہ، ڈاکٹر، جہانگیر بک ڈپو اُردو بازار، لاہور، ۱۹۹۴ء

۴۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر، پسِ نوشت اور پس پسِ نوشت، نیاز مانہ پبلی کیشنز، لاہور، س ن، ص ۴۰

۵۔ سیّد عبداللہ، ڈاکٹر، اُردو میں آپ بیتی، مشمولہ: نگار پاکستان (سالنامہ) کراچی، اصنافِ ادب نمبر، ص ۲۱۶-۲۱۷، ۱۹۶۶ء

۶۔ آلِ احمد سرور، خواب باقی ہیں، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۸

۷۔ مہر محمد خان نول، پسر دہقان، فیض بخت پرنٹنگ پریس، جھنگ، ۲۰۰۱ء،

۸۔ پرفیسر سمیع اللہ قریشی، بیتے لمحوں کی چاپ، بک ہوم پبلشرز لاہور، ۲۰۰۶ء

۹۔ 'مہر جیون خان' 'جیون دھارا' (کیکر کی چھاؤں سے کمشنر ہاؤس تک) سنگت پبلشرز لاہور ۲۰۰۶ء

۱۰۔ قصہ ایک درویش کا، از سردار باقر علی خان مشمولہ مجلّہ کاروان، گورنمنٹ کالج جھنگ ۹۲-۱۹۹۱ء

☆۱ مقامی زبان میں کشتی کے وہ تمام مسافر جو ایک پھیرے میں کشتی میں سما جائیں، اُسے ''پور'' کہا جاتا ہے۔

۲☆ 'بھینی' مقامی زبان میں مال مویشی کے باڑے اور بیٹھک کو کہا جاتا ہے۔

۳☆ 'واہر' افراد کا وہ گروہ جو چور کی تلاش میں نکلے ہوتے ہیں۔

☆☆ کارِ جہاں کی تیسری جلد بھی ۲۰۰۱ء میں شائع ہو چکی ہے۔